ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

1124

بچوں کا اسلام

اتوار ۲۲ شعبان ۱۴۴۵ھ
مطابق ۳ مارچ ۲۰۲۴ء

پاکستان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا بچوں کا مقبول ترین ہفت روزہ

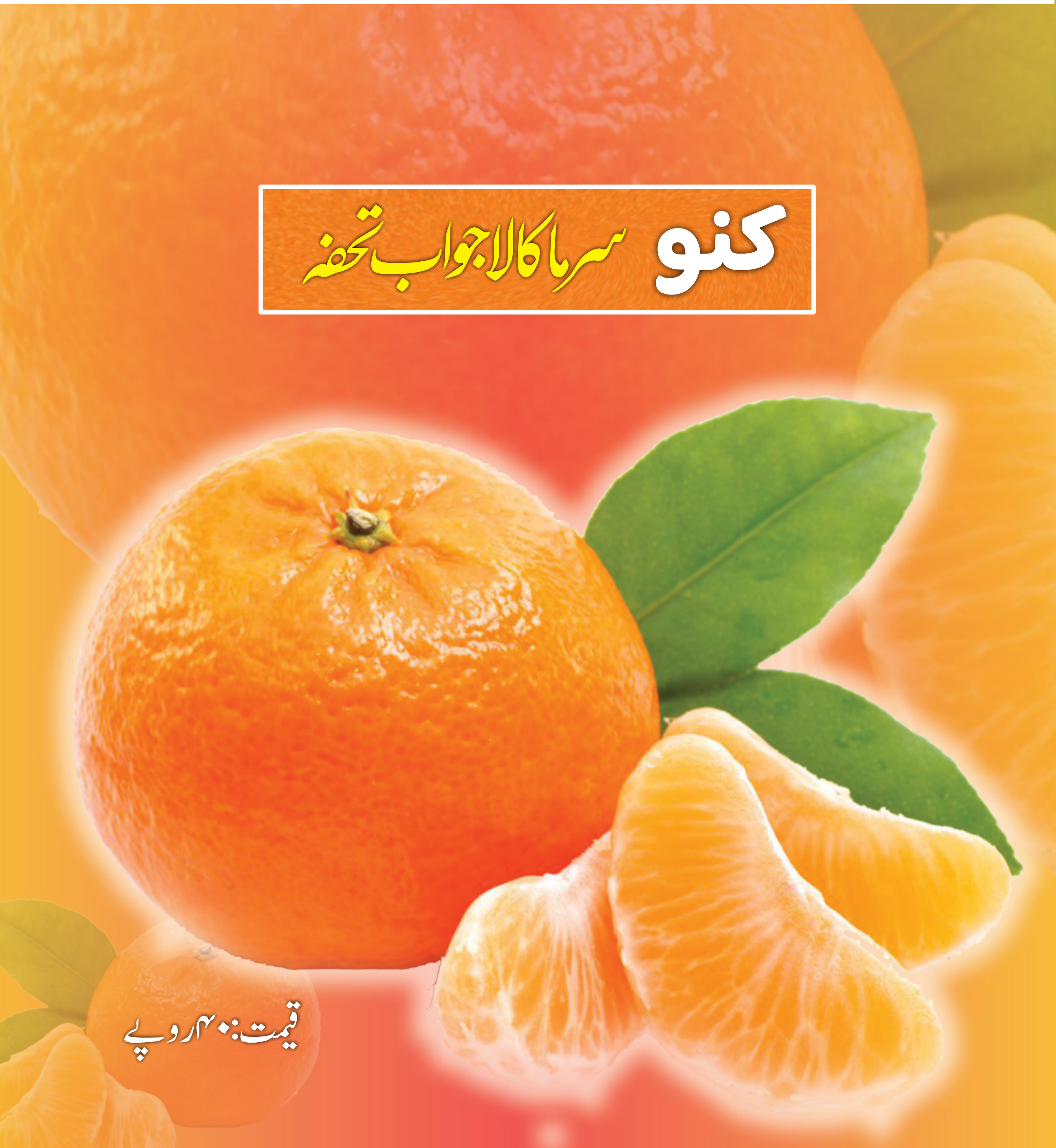

کتاب ہدایت

یہ کتاب قرآن مجید، اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام خدا ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور اللہ کی راہ میں ہمارے دیے سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو کتاب اے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں آپ سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں، سب پر ایمان لاتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ، آیات 2 تا 4)

ہدایت اسلام

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ اُس شخص کے لیے جنت کی خوشخبری ہے جسے اسلام کی ہدایت نصیب ہوگئی اور گزر بسر کے لیے روزی میسر آ گئی اور اُس نے قناعت وصبر اختیار کیا۔ (جامع الترمذی)

بہترین مقرر

عائشہ الیاس

میں احمد کا موبائل فون ہوں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں میز پر پڑا آرام کر رہا تھا کہ اچانک بہت دور بیٹھے میرے کسی ساتھی نے مجھے جگا دیا۔

مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی اور میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ آخر احمد کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے مجھے اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف اُس کا کوئی دوست تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ اس سے کم اَز کم ایک گھنٹے تک باتیں کرے گا۔

اس نے رات بھر میرے ذریعے ایس ایم ایس کیے تھے اور اب میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ مجھے ابھی توانائی کی ضرورت تھی۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور میری اسکرین ایک جھٹکے سے تاریک ہوگئی۔

”اُف! بیٹری کو بھی ابھی ہی جواب دینا تھا۔ ابھی تو مجھے فہد کو اپنی یومِ آزادی پر لکھی گئی تقریر کے بارے میں بھی بتانا تھا۔“

اُس نے بڑبڑاتے ہوئے مجھے چارجنگ پر لگا دیا۔

آج احمد کے اسکول میں تقریری مقابلہ تھا۔

احمد بڑے اعتماد کے ساتھ ڈائس پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔

میں اُس کی تقریر بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

”۱۴- اگست کا دن ہر سال آ کر ہمیں ہمارے بزرگوں کی قربانیاں یاد دلاتا ہے۔ اُن شہیدوں کی یاد دلاتا ہے جنھوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تو آج ہمیں آزاد فضا میں سانس لینے کا مواقع میسر آئے۔ یہ دن ہم سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم بھی اپنی صلاحیتوں کو وطنِ پاکستان کے لیے وقف کر دیں۔ خاصی طور پر نوجوان نسل کو چاہیے کہ وہ فضول سرگرمیوں میں اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے تعمیری کاموں میں اپنی صلاحیتوں کو صَرف کرے۔“

مجھے احمد کا رات بھر ایس ایم ایس کرنے اور گھنٹہ گھنٹہ بھر اپنے دوستوں سے باتیں کرنے میں وقت ضائع کرنا یاد آ گیا۔ پھر جب اُسے بہترین مقرر کا انعام ملا تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی، کیوں کہ وہ خود تو ان باتوں پر عمل کرتا نہیں تھا اور دوسروں کو نصیحت کرتا پھر رہا تھا۔ بہترین مقرر تو وہ ہوتا ہے جو خود بھی ان باتوں پر عمل کرتا ہو جن کی وہ دُوسروں کو نصیحت کر رہا ہے۔

جب احمد گھر واپس آیا تو بہت خاموش سا تھا۔ مجھے اُس وقت بہت حیرت ہوئی جب اُس نے پورے دن میں ایک بھی ایس ایم نہ کیا اور نہ گھنٹہ گھنٹہ بھر اپنے دوستوں سے بات کی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے میرے دل کی بات سن لی ہے۔

پھر یہ اُس کا معمول بن گیا کہ اب وہ مجھے صرف ضرورت کے وقت استعمال کرنے لگا اور جو وقت پہلے اُس کا فضول کاموں میں ضائع ہوتا تھا، اب وہ تعمیری کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اب وہ واقعی بہترین مقرر کہلانے کے لائق تھا۔

☆☆☆

اک روز پیش ہوں گے سبھی رب کے روبرو

محمد اسامہ سَرسَری

اب تک تو سونگھتا ہی رہا سازشوں کی بو
اب جنگ چھڑ چکی ہے، بتا کس طرف ہے تُو
اسلام کا زوال و ترقی ہے روبرو
تُو کس کے سامنے ہے؟ مجھے ہے یہ جستجو
اسلام اٹھ رہا ہے غزہ کی زمین سے
ایمان بک رہا ہے مگر باقی چار سو
اِن واقعات پر ہے تری کیسی خامشی!
دجالیات پر تھی تری کتنی گفتگو!
تو کٹ رہا ہے مجھ سے فقط بائیکاٹ پر
اس چاک دامنی کو میں کیسے کروں رفو
جو دشمن خدا ہے وہ میرا فریق ہے
جو متفق نہیں تو وہ اب سے مرا عدو
زیر و زبر اسامہ! یہ سب ہوگا ایک دن
اک روز پیش ہوں گے سبھی رب کے روبرو

☆☆☆

ابوحنظلہ سعدی

اذان دینے والے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین سے واپس آتے ہوئے راستے میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔

نماز کا وقت ہو چلا تھا۔لشکر کے مؤذن نے اذان دی۔مؤذن اذان دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک ایک جانب سے اذان کی آواز سنائی دی۔آواز بہت ہی خوب صورت اور دل کش تھی۔اذان دینے والے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اذان کا مذاق اُڑانے کے لیے اذان دے رہا ہے، لیکن اس کے باوجود آواز میں موجود دل کشی اور خوب صورتی نے سبھی کو متاثر کیا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا:

”اِس آذان دینے والے کو میرے پاس لاؤ!“

کچھ دیر بعد صحابۂ کرام چند لڑکوں کو لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے پوچھا: ”ابھی اذان کس نے دی تھی؟“

سب لڑکوں نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس لڑکے کو روک کر اس کے ساتھیوں کو واپس بھجوا دیا پھر آپ نے اس لڑکے سے فرمایا:

”مجھے بھی اذان سناؤ!“

لڑکا کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوگیا، کیوں کہ اُسے تو اذان یاد ہی نہیں تھی۔وہ تو ابھی کچھ دیر پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اچانک اسے مؤذن کی آواز سنائی دی تو مذاق اُڑانے کے انداز میں اس نے بھی شرارت سے اذان کے چند بول اُونچی آواز میں دوہرا دیے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ اسے اذان یاد نہیں ہے سو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اذان کے کلمات اُس کے سامنے دہرانے شروع کر دیے۔

لڑکے نے توجہ سے اذان کے الفاظ سنے تو اسے یاد ہو گئے اور اس نے اذان دینا شروع کی۔جب وہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر پہنچا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور یہ کلمات زبان کے ساتھ اس خوش نصیب لڑکے کے دل سے بھی نکلے۔اسلام کی عظمت اور محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی اور اُس نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ایک تھیلی میں تھوڑی سی چاندی مرحمت فرمائی پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی پیشانی سے لے کر سینے تک اپنا مبارک ہاتھ پھیرا اور اسے برکت کی دعا دی۔

یہ ننھے صحابی حضرت ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔اسلام قبول کرنے کے بعد اُنھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گزارش کی:

”یارسول اللہ! مجھے مکہ میں اذان دینے کی اجازت مرحمت فرما دیجیے!“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی درخواست قبول فرمائی۔ابومحذورہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اجازت ملنے پر مکہ چلے گئے اور مکہ مکرمہ میں مستقل اذان دینے کی خدمت سرانجام دینے لگے۔اُن کی آواز بہت ہی خوب صورت اور دلکش تھی۔اذان اتنے دلنشین انداز میں دیتے تھے کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔ان کی اذان اتنی مشہور ہوئی کہ عربی شعرا اپنے اشعار میں اُن کی قسمیں کھانے لگے۔

ابومحذورہ چونکہ مکہ کے مؤذن تھے اس لیے ہمیشہ مکہ ہی میں رہے۔مکہ ہی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں ۵۹ ہجری میں وفات پائی۔

اللہ اُن سے راضی ہو۔

☆☆☆

صدقہ

فرحان احمد

حدیث مبارکہ ہے کہ ”بُرائی سے منع کرنا بھی صدقہ ہے۔“

آپ جماعت میں داخل ہوئے۔آپ نے دیکھا کہ آپ کا دوست میز پر کچھ لکھ رہا ہے۔اسکول میں موجود تمام چیزیں جیسے میز، کرسی، بورڈ وغیرہ آپ کے پاس اسکول انتظامیہ کی امانت ہیں۔آپ ان چیزوں کے مالک ہرگز نہیں ہوتے، بلکہ اسکول انتظامیہ نے آپ کو اجازت دی ہوئی ہے کہ آپ روزانہ جماعت میں موجود کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں، میز استعمال کرسکتے ہیں۔اب اگر آپ میز اور کرسی پر کچھ لکھیں گے، سیاہی چھینک کر اُسے گندا کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی، کیوں کہ اسکول انتظامیہ نے آپ کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت تو دی ہے، اس پر لکھنے کی نہیں۔

سو میز پر لکھنا خیانت ہوگا اور خیانت بڑا گناہ ہے۔

کوشش کریں کہ آپ خود اس گناہ سے بچیں۔اگر آپ کا کوئی دوست یا ہم جماعت یہ گناہ کر رہا ہے تو اُسے پیار اور حکمت سے منع کریں۔کوئی اسکول کے میدان میں لگی پھلواری سے پھولوں کو توڑتا ہے تو اُسے سمجھائیں کہ پھولوں کو توڑنا بری بات ہے۔اپنے دوستوں کو سمجھائیں کہ دُوسروں کو تنگ کرنا اور اُن کی چیزیں بغیر اجازت کے استعمال کرنا بھی اچھی بات نہیں۔دُوسروں کو بُرے کاموں سے روکنا بہت بڑی نیکی ہے۔

اُمید ہے آپ یہ بڑی نیکی کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔

☆☆☆

خط کتابت کا پتا: دفتر روزنامہ اسلام، ناظم آباد، کراچی
bkislam4u@gmail.com, 021 366 099 83

ادارہ روزنامہ اسلام کی تحریری اجازت کے بغیر بچوں کا اسلام کی کوئی تحریر کہیں شائع نہیں کی جاسکتی۔بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کرنے کا حق رکھتا ہے۔

سالانہ زرتعاون: اندرون ملک 2000 روپے بیرون ملک ایک میگزین 25000 روپے دو میگزین 28000 روپے انٹرنیٹ: www.dailyislam.pk

شہ رگ

حماد ظہیر

ان کی کوشش ہمیشہ سے یہی ہوتی ہے کہ دو چار نہیں بلکہ کم از کم دس ہزار لوگوں سے پٹیں۔ اگر ان کا صرف ہاتھوں، مکوں سے گزارا ہو جاتا تو شاید ان کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتے مگر وہ تو لاتوں کے بھوتوں کے بھی سردار ہیں۔

ہم نے بہت سمجھایا کہ ہم دس بارہ بلیک بیلٹ قسم کے کراٹے ماسٹر چن لاتے ہیں۔ ان سے اچھی طرح پٹ کر ایک ہی مرتبہ اپنی ہڈی پسلی ایک کروا لو، مگر مرزا ہمیشہ نت نئے طریقوں ہی کی تلاش میں رہے۔

یہ طریقے ایسے ہوتے تھے کہ ہم مرزا کو بچانے کے بجائے از خود دو دھپل لگانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہمارے حساب سے ایسے موقعوں پر مرزا سے لڑنا ایک نیکی، ان کو مارنا کارِ ثواب اور ان کو پیٹنا کسی کارِ خیر سے کم نہ تھا۔

☆......☆

شجاعت مرزا کو کوئی نہ کوئی نیا معرکہ برپا کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اچھی بھلی پانچ فروری کی چھٹی ہوا کرتی تھی، مگر اس نے پرنسپل صاحب کے کان ایسے بھرے کہ انھوں نے اس دن ایک نمائش کا اعلان کر دیا۔

کالج کے احاطے ہی میں عمارت کے ساتھ ایک بہت بڑا میدان تھا، جہاں طلبہ نے اس خصوصی دن کی مناسبت سے اسٹال لگانے تھے۔ اس نمائش کو صرف کالج ہی کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کے لیے بھی کھولا جانا تھا، لہٰذا اس کے اوقات شام اور رات کے رکھے گئے تھے۔

سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے اسٹال کے لیے پرنسپل صاحب کی طرف سے خصوصی انعام تھا اور اسی نے جھگڑا ڈال دیا تھا۔

ہر اسٹال والے، دوسرے اسٹال والوں کو اپنا دشمن خیال کر رہے تھے۔ مدد کرنا تو درکنار، کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ نمائش کے لیے دکھائی جانے والی چیزوں کی کسی اہم راز کی طرح حفاظت کی جا رہی تھی۔ ہر کوئی دوسرے کی ٹوہ میں تھا کہ اس نے کچھ انوکھا نہ کر لیا ہو۔

ہم عموماً ایسے جھگڑوں میں کم ہی پڑتے مگر شجاعت ساتھ ہو تو سوچ ضرور لیتے تھے۔

شجاعت ہی کے کہنے پر ہم نے ایک اسٹال بک کرا لیا، لیکن اس کا اندازہ تو شاید ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں تھا کہ اس میں رکھا کیا جائے گا؟

''کیوں شجاعت، ہمارے اسٹال میں کیا ہوگا؟''

''پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا!''

مرزا کسی شاعر کی طرح بولے۔

''کیا؟ کشمیر ڈے پر ہم لوگ کھانے پینے کا اسٹال لگائیں گے!'' ہم آپے سے باہر ہو گئے۔

''تو کیا کشمیر ڈے پر لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں؟''

مرزا نے بحث شروع کر دی۔

ہم سمجھ گئے کہ وہ بتانا نہیں چاہتے، اور ایسے میں ان سے کچھ اگلوا لینا مرغے سے انڈا دلوانے کے مترادف تھا۔

''ہماری کوئی مدد چاہیے تو ابھی بتا دو، ورنہ بعد میں سارا کچھ تمھیں اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔'' ہم نے بے نیازی سے کہا اور چل دیے۔

''ارے ارے رکو...... مدد تو چاہیے!''

شجاعت چلایا تو ہم ٹھہر گئے۔

''پانچ کلو باسمتی چاول، تین کلو گوشت، تیل، دھنیا، کڑھی پتا......!''

ہم نے لاحول پڑھا اور دوبارہ چل دیے!

☆......☆

ہمارا خیال تھا کہ شجاعت کے بچے نے ضرور کچھ نہ کچھ سوچ کر ہی وہ اسٹال بک کرایا ہوگا اور ہمارے پیٹھ پیچھے وہ اس میں کسی نمائش کی تیاری کر رہے ہوں گے، مگر تف ہے ہمارے اس خیال پر جو ہم نے شجاعت کے بارے میں کبھی مثبت سوچا ہو، کیونکہ وہ کچھ نہیں کر رہا تھا۔

ہم نے صبح میں، شام میں، دوپہر میں، رات میں، چھپ کر اور اعلانیہ، ہر طریقے سے تفتیش کر کے دیکھ لی مگر ہر زاویے سے مرزا کو ست اور نکما پایا۔

یہاں تک کہ جب چار فروری آ گئی تو ہم پھٹ پڑے۔

''آخر ہم لوگ نمائش میں کیا پیش کریں گے؟''

''ہم لوگ نہیں، صرف ہم کہو، کیونکہ اسٹال تو تمھارے نام سے بک ہوا ہے۔''

ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہمیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پرنسپل صاحب کو تو جواب دہ ہم ہوں گے۔

''لیکن ایسا تو ہم نے تمہارے کہنے پر کیا تھا!''

ہم اپنی پریشانی اور غصہ دونوں پر قابو رکھتے ہوئے بولے۔

”آدھی بات مانو گے اور آدھی نہیں تو ایسا ہی ہوگا میرے دوست!“

وہ انتہائی سکون سے بولے۔

”کیا آدھی بات؟“ ہم حیران رہ گئے۔

”مطلب یہ کہ اسٹال تو بک کروالیا، لیکن نہ چاول لاکر دیے، نہ تیل پیاز گوشت، اب پلاؤ بنے تو کیسے بنے؟“

”یہ خیالی پلاؤ تم ساری زندگی پکاتے رہنا، ہم انتہائی سنجیدہ ہیں!“

ہم نے اسے پٹری پر لانے کی کوشش کی!

”یقین مانو! اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارے اسٹال کو سب سے زیادہ پسند کیا جائے تو......“

ہم ہمہ تن گوش ہوگئے۔

”......تو لوگوں کی پسندیدہ ڈش بناؤ اور کھلاؤ، پیسے بھی ملیں گے اور داد بھی۔“

ہم مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

”دوسروں کو اس کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا کہ وہ کشمیر سے متعلق تصاویر رکھیں۔“

ہم نے شجاعت کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ظاہر ہے......اب وہ کشمیر کے سیب یا شالیں تو رکھنے سے رہے۔“

”بہت خوب، آئیڈیا برا نہیں!“ ہم نے خوش ہو کر چٹکی بجائی۔

”ارے میں تو سمجھتا تھا کہ بھری دنیا میں اکیلا ایک میں ہی احمق ہوں، مگر تمھیں دیکھ کر بہت حوصلہ ملتا ہے!“

مرزا سرد آہ بھر کر بولے تو ہم تلملا کر رہ گئے۔

☆......☆

نمائش رات میں ہونی تھی، کیونکہ سردیوں کی شامیں تو ویسے ہی بڑی مختصر ہوتی ہیں۔

ہر کوئی بڑھ چڑھ کر اپنا اسٹال سجانے میں مصروف تھا۔ انعام جیتنے کی کوشش میں خوب خرچہ بھی کیا گیا تھا۔ بڑے بڑے رنگ برنگے پوسٹر لگائے گئے تھے۔ برقی قمقمے لگا کر اسٹال کو چار تارے لگا دیے گئے تھے۔ اندھیرے کا خیال رکھتے ہوئے بڑی بڑی لائٹیں بھی لگائی گئی تھیں۔ کچھ نے تو اسپیکر پر کشمیری ترانے چلانے کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔

ہم انتظامات دیکھ کر زمین میں گڑے جا رہے تھے کہ ہمارے اسٹال پر ایک بلب تک نہ تھا۔ اور ہم نے بڑی مشکل سے جو کشمیر کی دو چار تصاویر اور ایک کشمیری شال حاصل کی تھی، وہ پوری نمائش میں ایک ٹاٹ کے پیوند سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔

شجاعت مرزا غائب تھے، ہم رہ رہ کر انھیں کوس رہے تھے کہ کہاں ہمیں اکیلے پھنسا گئے۔ خیر ہم نے فیصلہ کرلیا کہ نمائش شروع ہونے سے پہلے پہلے ہم بھی کہیں روپوش ہو جائیں گے!

ایک اسٹال والے تو کشمیر پر کوئی ڈاکومنٹری چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہم شرم سے ڈوب ہی تو مرے کہ تھوڑا دماغ لگاتے تو کچھ ایسا ہی ہم بھی کر لیتے، مگر ہمیں تو اس شجاعت کے بچے نے اس حال تک پہنچا دیا کہ اگر نہ رہتے اس کے آسرے پر تو کچھ کر ہی جاتے۔ نہ بھی کرتے تو کم از کم یہ اسٹال تو نہ لیتے۔ کتنی امیدوں سے پرنسپل صاحب نے کہا تھا:

”تم سے اور شجاعت سے مجھے بہت عمدہ خیال کی توقع ہے۔“

بہر حال اب پانی سر سے گزر چکا تھا، بلکہ سر سے کیا پرنسپل سے بھی گزر چکا تھا۔ پچھتانے کے ساتھ ساتھ صرف ایک کام اور بچا تھا، شجاعت کو مار مار کر گنجا کر دینا۔

نمائش کا وقت شروع ہوا تو تھوڑے تھوڑے کر کے لوگ آنے شروع ہوئے۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھا رش بھی بڑھنا شروع ہو گیا اور رنگ برنگی روشنیوں نے اسٹالوں کی خوبصورتی کو

اور زیادہ جگمگانا شروع کر دیا۔

ہر کوئی اپنے اسٹال اور نمائش کی چیزوں کو بڑھ چڑھ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ شاید شجاعت دیر سویر پہنچ ہی جائے، مگر وہ حضرت سرے سے تشریف ہی نہیں لائے تھے۔ ہمارا اسٹال اندھیرا اور ویران پڑا ساری نمائش کے لیے ایک بدنما داغ بن چکا تھا۔ ہمیں اپنی شامت قریب ہی دکھائی دے رہی تھی اور ہم وہاں سے کھسکنے کا پکا پروگرام بنا چکے تھے کہ یکا یک سارے میدان میں اندھیرا چھا گیا۔

شاید بجلی چلی گئی تھی۔

دو ایک لڑکے عمارت کی طرف دوڑے تا کہ جنریٹر چلائیں۔

اسٹال والے عوام کو تسلیاں دے رہے تھے کہ ابھی چند ہی لمحوں میں بجلی آ جائے گی اور روشنی ہو جائے گی۔ مگر کافی دیر تک بھی کچھ نہ ہوا تو بہت سارے لوگ قافلے کی صورت میں عمارت کی طرف بڑھے۔

وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ عمارت کے صدر دروازے کی گرل اندر سے لاک ہے اور وہاں ایک منحنی سا اول جلول لڑکا سر جھکائے بیٹھا ہے۔

''دروازہ کھولو، ہمیں جنریٹر چلانا ہے یا خود ہی چلا دو۔''

کسی نے کہا مگر لڑکے کے کان پر جوں تک نہ رینگی، شاید وہ سو رہا تھا۔

جلد ہی لوگوں کی باتیں شور شرابے اور چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئیں اور وہ گرل پر لاتیں مکے برسانے لگے......مگر!

مگر لڑکا ٹس سے مس نہ ہوا۔ لگتا تھا وہ سویا نہیں بلکہ ہیڈ ڈاؤن کیے شاید مر ہی چکا ہے۔

جب تک لوگوں نے گرل توڑنے کا فیصلہ کیا اس وقت تک نمائش میں آنے والے تقریباً سارے ہی عوام وہاں جمع ہو چکے تھے۔ اتنا رش کسی ایک لڑکے کے پاس جمع ہوتا دیکھ کر ہماری چھٹی سے لے کر تیرہویں تک ہر حس پھڑکی اور ہم دل تھام کر رہ گئے۔

اچانک لڑکے نے سر اٹھایا اور پھر کھڑا ہوتے ہوئے بولا: ''خاموش......!''

مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور ہمیں ناگ، وہ بھی کالا اور خطرناک کہ یہ آواز کسی اور کی نہیں بلکہ شجاعت مرزا کی تھی۔

وہ کہہ رہے تھے: ''جنریٹر چلانے کی ضرورت نہیں۔ بجلی نہیں گئی ہے بلکہ میں نے مین سوئچ بند کر دیا ہے۔'' انھوں نے اپنا کارنامہ بتایا اور ایسے مسکرائے کہ ان کی بتیسی اندھیرے میں چمکنے لگی۔

ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آج ان کے بتیس دانت سمیت دو سو چھے ہڈیاں ٹوٹ کر رہیں گی کیونکہ انھوں نے منصوبہ بندی ہی ایسی کی تھی کہ دو چار سے نہیں بلکہ کم از کم دس ہزار لوگوں سے پٹیں!

☆......☆

''شجاعت! آخر تم نے مین سوئچ کیوں بند کر دیا؟ کیا تمھیں پتا نہیں تھا کہ میدان میں ایک نمائش ہو رہی ہے۔ بے شمار لوگ وہاں آئے ہوئے ہیں۔''

کسی نے گویا ایک تازہ اور انوکھی خبر دی۔

''پتا ہے!'' شجاعت نے کندھے اچکائے۔

''پھر کیوں تم نے مین سوئچ بند کیا؟'' اس مرتبہ سختی سے پوچھا گیا۔

''میری مرضی!'' شجاعت اڑیل پن سے بولا۔

''تمھاری مرضی نہیں، یہ پورے کالج کا معاملہ ہے، سوئچ کھولو ورنہ......''

''ورنہ کیا؟ تم لوگ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ گرل کوئی عام گرل نہیں ہے۔ اسے توڑنے میں کم از کم چار پانچ گھنٹے لگیں گے!'' شجاعت مکاری سے بولا۔

ہمیں اس کی تکہ بوٹی ہوتی قریب ہی نظر آئی کیونکہ طلبہ اس بات پر بھڑک اٹھے اور لگے الٹی سیدھی چیزوں سے گرل کو ٹھوکنے پیٹنے۔ کوئی لکڑی سے ٹھوک رہا ہے تو کوئی سریے سے پیٹ رہا ہے۔ کسی نے تو اٹھا کر گملا تک دے مارا۔

مگر بے اثر رہا گرل پر بھی اور شجاعت پر بھی، دونوں ڈھیٹ نکلے۔

آخر کچھ صلح جو قسم کے لوگ آگے بڑھے اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے شجاعت کو سمجھانے بجھانے لگے۔

کافی کچھ سننے کے بعد شجاعت بولا: ''ہر اسٹال والا مجھے پچاس روپے دے تو کھول سکتا ہوں۔''

ہم تو شجاعت کے نیچ پن پر بلبلا گئے اور تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس سے سوائے دشمنی کے اور کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔''

اسی وقت پرنسپل صاحب بھی تیزی سے آتے دکھائی دیے۔ کوئی طالب علم انھیں ساری کتھا سنا کر بلا لایا تھا۔

''یہ کیا ناٹک ہے شجاعت؟'' وہ غصے سے بولے۔

''سر! میں نے صرف مین سوئچ ہی تو بند کیا ہے، ان کے اسٹال میں کوئی توڑ پھوڑ تھوڑا ہی کی ہے بلکہ میں تو نمائش کے قریب بھی نہیں گیا، پھر بھی نجانے کیوں یہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' شجاعت بھولے پن سے بولا۔

''تم نے ان کی بجلی بند کر دی، ان کے اسٹال سے زندگی ختم کر دی اور کہتے ہو کہ کچھ نہیں کیا؟''

''انھیں شکر کرنا چاہیے کہ میں نے صرف یہی کیا۔ اگر میں کسی طرح انھیں تیز وولٹیج مار دیتا تو نہ صرف ان کی لائٹیں اور برقی آلات جل جاتے بلکہ ان سے ایسی آگ لگتی کہ سب کچھ ختم ہو جاتا۔'' شجاعت سفاکی سے بولا۔

''مگر تم ایسا کیوں کرتے شجاعت؟'' پرنسپل صاحب حیرانی سے بولے۔

پورے مجمع پر سناٹا طاری تھا اور ہر کوئی اس بات کا جواب سننے کے لیے بے چین تھا۔ اور شجاعت آخر شجاعت تھا۔ وہ سماں باندھ ہی لیا کرتا تھا۔

''کیونکہ میں نے ان کی شہ رگ پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب چاہے اسے بند کر کے ان کی سانس روک دوں اور جب چاہے اس سے زہر اتار دوں جو سارے جسم تک خود بخود پھیل جائے۔ یوں سمجھ لیں کہ میں بھارت ہوں جس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔ پاکستان کی شہ رگ پر۔ جب چاہے پانی بند کر کے فصل تباہ کر دے، اور جب چاہے زیادہ پانی کھول کر سیلاب برپا کر دے۔'' شجاعت مطلب کی بات پر آ ہی گیا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر پرنسپل صاحب بولے: ''پھر اب کیا ہو گا شجاعت؟''

''ان لوگوں سے کہیں کہ یہ اپنا مسئلہ مجھ سے بات چیت کے ذریعے حل کر لیں۔ میرا کیا جاتا ہے کرتا رہوں گا زندگی بھر بات چیت۔ وقتاً فوقتاً پیسے بھی بٹورتا رہوں گا مگر بجلی میں نے نہیں کھولنی۔ آخر دشمن کے پانی سے اپنی فصلیں سیراب ہوں تو کیا برا ہے۔ بجلی اور توانائی پیدا ہو تو کیا برا ہے؟ آپ کرتے رہیے مذاکرات سارہ رات۔''

شجاعت کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

اب سب کو سمجھ میں آ گیا کہ طاقت کے زور پر دشمن کو اپنی شہ رگ سے بے دخل کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

شجاعت نے کونے پر رکھا ایک چندے کا ڈبہ اٹھایا اور گرل کے پاس رکھ دیا۔
سب سے پہلے تمام اسٹال والے آگے بڑھے اور انھوں اس میں پچاس پچاس روپے ڈالنے شروع کر دیے۔
شجاعت نے پہلے مین سوئچ کھولا، پھر گرل کا دروازہ اور ہمیں وہ ڈبہ پکڑاتے ہوئے بولا:
’’اپنے اسٹال پر یہ ڈبہ رکھ دو۔ نمائش سے محظوظ ہونے والے لوگ اگر دس روپے بھی اس میں ڈال دیں تو شاید یہ ان کے لیے زیادہ فائدے مند ثابت ہو۔‘‘
ہم سب نے دیکھا تو ڈبے پر آڑھی ترچھی خوشخطی سے لکھا تھا:
’’جہاد کشمیر فنڈ۔‘‘
☆☆☆

درود و سلام کے مسنون صیغے

(17)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”زاد السعید“ کے نام سے صلوٰۃ وسلام پر مشتمل چالیس صیغے جمع فرمائے۔

حضرت لکھتے ہیں: ”جو صیغے صلوٰۃ وسلام کے احادیث میں آئے ہیں اُن میں سے چالیس صیغے پیش ہیں جن میں سے پچیس صلوٰۃ کے اور پندرہ سلام کے ہیں۔“

انہی مسنون صیغوں سے ہر ہفتے درود وسلام کا ایک صیغہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قارئین! انھیں یاد کیجیے، روزانہ پڑھنے کا اہتمام کیجیے اور اپنے دوستوں کو بھی یاد کروائیے۔ اس طرح درود وسلام کا اجر بھی ملے گا، تلاوت حدیث کا بھی اور چالیس احادیث یاد کرنے کروانے پر ازروئے حدیث قیامت کے دن علماء کرام کے ساتھ اٹھائے جانے کی بشارت کے مستحق بھی آپ بن جائیں گے۔ کیوں ہے نا مزے کی بات؟! (مدیر)

صلوٰۃ کا سترھواں صیغہ:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَ سَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّارْحَمْ مُحَمَّداً وَّ آلَ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَ بَارَکْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ فِی الْعٰلَمِیْنَ إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ.

ملاحظہ:

سلام کے صیغے پندرہ تھے جو ابتدائی پندرہ اقساط میں مکمل ہو چکے ہیں۔

***

تنویر پھولؔ

مادرِ مہرباں

رب نے ’احقاف‘ میں ہے سراہا تجھے
تُو ہے عظمت نشاں مادرِ مہرباں
تیری الفت کا سایہ اگر سر پہ ہو
زندگی گلستاں مادرِ مہرباں
تیری آغوش میں کیا ہے ملتا سکوں
رب نے بخشی ہے اک نعمتِ بے بہا
تیرے قدموں میں جنت خدا نے رکھی
پیار کی کہکشاں مادرِ مہرباں
دھوپ کی سختیوں سے بچاتی ہے تُو
مامتا تیری ہے چاندنی کی طرح
یاس کی ظلمتوں نے جو گھیرا کبھی
تو ہوئی ضو فشاں مادرِ مہرباں
اس جہاں میں نہیں کوئی اس کا بدل
تیری چاہت زمانے میں مشہور ہے
تو ہی بچوں کو دیتی ہے خونِ جگر
ان کی تو پاسباں مادرِ مہرباں
کان میں بجنے لگتی تھیں شہنائیاں
نیند کی وادیاں کیا سکوں بخش تھیں
یاد آتی رہیں گی مجھے عمر بھر
تیری سب لوریاں، مادرِ مہرباں
تو بچائے ہمیں گرم سے، سرد سے
تجھ کو جذبہ محبت کا رب نے دیا
تیرا سایہ بڑا ہی سکوں بخش ہے
تو ہے اک سائباں مادرِ مہرباں
جان سے اپنی بڑھ کر ہے تو چاہتی
پھولؔ کہتا ہے مشفق ہمیشہ ہے تُو
اور تیری محبت بھی بے لوث ہے
لطف کا آسماں، مادرِ مہرباں

(ملاحظہ: سورہ نمبر ۴۶ احقاف کی آیت نمبر ۱۵ میں ماں کی محبت کا ذکر ہے!)

مشکل الفاظ:

☆ مادرِ مہرباں......مہربان ماں ☆ یاس......مایوسی ☆ ضوفشاں......روشنی دینے والے
☆ شہنائیاں......خوشی کے گیت ☆ سائباں......ٹھکانہ ☆ مشفق......شفقت کرنے والی

کنو سرما کالاجواب تحفہ

لیاقت علی۔تلمبہ

آج کل بازار میں داخل ہوتے ہی سر منڈاتے ہی اولے پڑے والا حال ہوتا ہے:

’’کنو سو کے دو کلو، کنو سو کے دو کلو!‘‘

اور سنا ہے کہ کراچی میں یہ کلو کی بجائے درجن کے حساب بکتے ہیں یعنی:

’’کنو!......ڈھائی سو درجن!‘‘

اب پتا نہیں درجن میں خریدنے والے کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے یا کلو میں؟

خیر تو بات ہو رہی تھی اُن آوازوں کی جو ان دنوں بازار میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے تابڑ توڑ سماعت سے ٹکراتی ہیں۔ ہر ریڑھی والا یہ آواز لگانے میں دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کنو بھی کیا عجیب پھل ہے۔ قدرت کے کرشموں میں سے ایک کرشمہ ہے۔ گرمیوں میں آم اور سردیوں میں کنو، دونوں ہی ہمارے پسندیدہ پھل ہیں۔ پسندیدہ بھی ایسے کہ ساری گرمیاں ہمیں کنو کا بے تابی سے انتظار رہتا ہے اور ساری سردیاں آم کا۔ آم ہی کی طرح ہم اس کے اتنے دیوانے ہیں کہ اس کے خاندان کے ہر پھل سے محبت کرتے ہیں اور کسی کی جان بخشی نہیں کرتے سوائے شکری اور ریڈ بلڈ کے۔

کنو کے یہ دونوں بھائی بند ہمارے یہاں دستیاب نہیں ہوتے سو ہماری یلغار سے محفوظ رہتے ہیں۔ جب کہ مسمی ہوں یا فروٹر بازار میں آتے ہی ہم ان کا تیا پانچہ کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ان سب کی بہن کھٹی کو بھی نہیں چھوڑتے۔

اگست ستمبر میں مسمی کے ساتھ ہی کھٹیاں بھی اپنا جلوہ دکھانے لگتی ہیں۔ بس جناب مابدولت تو ان کے انتظار میں ہی ہوتے ہیں سو ان کے جلوہ نما ہوتے ہی آپریشن کلین اپ شروع ہو جاتا ہے۔

اپنی دیوانگی میں ہمیں اپنے گلے کا بھی خیال نہیں رہتا۔ وہ بے چارہ دہائی دیتا رہتا ہے کہ بھئی خدا کے لیے بخش دو مگر اس وقت اس کی پکار نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتی ہے۔

یہ کھٹیاں جہاں ہیں جیسے ہیں کی بنیاد پر کھائی جاتی ہیں۔ یہ سب سے پہلے بھٹوں یعنی چھلیوں والے کے پاس دکھائی دیتی ہیں پھر چاٹ بیچنے والوں کے پاس اور پھر آخر میں دکانداروں کے پاس تشریف فرما ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مولی کے موسم میں ریڑھی پر مولی فروشوں کے پاس بھی جھلک دکھلاتی ہیں۔ ہم انھیں مگر کہیں بھی نہیں چھوڑتے اور کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ یہی حال مسمی اور فروٹر کا ہوتا ہے۔ تاہم کنو کے آتے ہی اصل گیم شروع ہوتی ہے۔

مانو ہمارے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں بلکہ سونا چاندی سب ہو جاتا ہے۔

کنو کو تین طرح سے کھایا جا سکتا ہے:

۱۔ چھیل کر پھانکیں الگ کر کے۔

۲۔ دو حصوں میں کاٹ کر۔

۳۔ اور جوس نکال کر۔

ہمارا سب سے پسندیدہ طریقہ دو نمبر ہے۔ یعنی ہم اسے دو حصوں میں کاٹ کے دونوں حصوں پر خوب ڈھیر سارا نمک مرچیں لگا کے چوستے ہیں اور پھر آخر میں سارا رس نکل جانے کے بعد اس کی آدھی کٹی پھانکیں بھی کھا جاتے ہیں۔

کنو کھانے کے لیے موسم سرما کا ہونا ضروری ہے۔ آم اور کینو کے معاملے میں ہمارا خیال بھی وہی ہے جو چچا غالب کا ہے یعنی آم یا کنو ہوں اور بہت ہوں۔ کنو کے لیے ہمارا سب سے پسندیدہ موسم یہ ہے کہ خوب دھوپ نکلی ہوئی ہو اور ہلکی ہوا چل رہی ہو۔ بہت سارے موٹے موٹے اور لال لال کنو ہوں۔ نمک و مرچ دانی ہو اور ایک عدد تیز چھری۔ بس چھیل چھیل کر پھانکوں پر نمک لگا کر کھاتے جائیں یا پھر کاٹ کاٹ کے نمک مرچیں لگا کر ان کا رس منہ میں ٹپکاتے جائیں۔ بس پھر نہ تو وقت گزرنے کا احساس ہو گا اور نا ہی غائب

ہوتے کنوں کا۔ دو چار کلو تو منٹوں میں چکھتے چکھتے ہی نکل جائیں گے۔

کنو کھانے کا سب سے زیادہ مزا کنو کے باغ میں درخت سے کنو توڑ کر کھانے میں آتا ہے۔ کنو کھانے کے معاملے میں بچپن میں ہماری یہی مشق رہی ہے۔ ہماری زمینوں کے ساتھ والی زمین پر کنوں کا باغ لگا ہوا تھا، جہاں ہم باقاعدگی سے جاتے اور کنوں پر جی بھر کے ہاتھ صاف کرتے تھے۔ تاہم ہم باغ والے سے کنو خرید کر کھاتے تھے۔ البتہ درختوں سے اپنی مرضی کے کنو خود توڑتے تھے۔ کبھی کبھار باغ ہی میں فرش بریں پر برسین میں لگے سرسبز ساگ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کھاتے اور کبھی جو زیادہ موڈ میں ہوتے تو باغ کے باہر بنے پانی کے کھال میں ٹھنڈے پانی میں پیر لٹکا کے بیٹھ کے کھاتے تھے۔ اب تو ہمارے علاقے سے کنوؤں کے باغات گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے ہیں اور ملتان لاہور جاتے ہوئے دور دور اور خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

خیر مینگو پارٹی کی طرح سردیوں میں ہم کبھی کبھار اورنج پارٹی بھی رکھ لیتے ہیں۔ اس کے لیے منڈی سے جا کر کنوں کی دو تین پلیاں لی جاتی ہیں اور پھر دن دس بجے کے بعد پارٹی شروع ہو جاتی ہے جس میں مرچیں کھانے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ مطلب لال پسی مرچیں کنو پر لگا کر کھانے کا مقابلہ۔ آہا کیا لطف آتا ہے جب کنو شریف پر نمک کے ساتھ لال مرچیں تھوپ کر چوسا جاتا ہے۔ اس لطف کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے تمام پھلوں کی طرح کنو بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس کے بہت سے فوائد ہیں۔ آیئے ہاتھ لگے اس کے کچھ فوائد بھی جان لیتے ہیں تاکہ معاملہ یک نہ شد دو شد کے مصداق سونے پر سہاگہ ہو جائے۔

کنو وٹامن سی اور منرلز سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ بدہضمی دور کرتا ہے اور نظام ہضم کو بہتر بناتا ہے۔ سینے میں موجود جلن اور تیزابیت کو ختم کرتا ہے اور قوت مدافعت کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کا چھلکا جلد کے داغ دھبے اور کالے نشانات کا خاتمہ کرتا ہے اور جلد میں قدرتی نکھار پیدا کرتا ہے۔ کنو جسم سے پانی کی کمی کو دور کرتا ہے۔ یہ جگر کی گرمی کو بھگاتا ہے اور یرقان کی بیماری میں فائدہ کرتا ہے۔ اگر اس کو کالی مرچ اور کالے نمک کے ساتھ کھائیں تو تلی کے امراض میں مفید ہے۔ نظر تیز کرتا ہے۔ پھوڑے، پھنسیوں میں کنو کا رس بغیر نمک، مرچ پینا مفید ہوتا ہے۔ دانت نکالنے والے بچوں کو اس کا جوس پلایا جائے تو دانت نکلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کنو اگر دکھنی مرچ اور کالے نمک کے ساتھ استعمال کریں تو دماغ کے لیے بے حد مفید ہے۔ کنو کا گلائسمک انڈیکس ۴۰ سے ۵۰ تک ہے اس لیے یہ شوگر فرینڈلی ہے۔ کنو کے چھلکوں کے اندر اور پھانکوں پر سفید رنگ کے ریشے نزلہ زکام کو ختم کرتے ہیں۔ اس کے چھلکوں کو سکھا کر میٹھے چاولوں یعنی زردے میں ڈالا جاتا ہے جس سے زردے کا ذائقہ دوبالا اور خوشبو لاجواب ہو جاتی ہے۔

آج کل کنو اپنے عروج پر ہے اور یہ بازار میں وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ ہمارے یہاں اچھا کنو سو روپے میں دو کلو مل جاتا ہے۔ اچھے کنو کی پہچان بھی بتاتے چلیں کیا یاد کریں گے۔ زردی مائل اور قدرے سرخ رنگ کا کنو جو تھوڑا سخت ہو مطلب نرم یا پلپلا نہ ہو اچھا کنو کہلاتا ہے، لہٰذا اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ خود بھی کھائیں اور اپنے بچوں کو بھی جی بھر کے کھلائیں لیکن خیال رہے کہ سموگ کی بہن فوگ اور بھائی بادل نہ ہوں ورنہ بچوں کے معاملے میں بالخصوص الٹی گنگا بہہ سکتی ہے اور لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ ہماری طرح سورج میاں کو دکھا دکھا کر خوب کھا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ''کنو نامہ'' ختم ہوا۔ جایئے جلدی سے کنو لایئے اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

☆☆☆

کیا اِن میں کوئی بھی عثمان نہیں؟

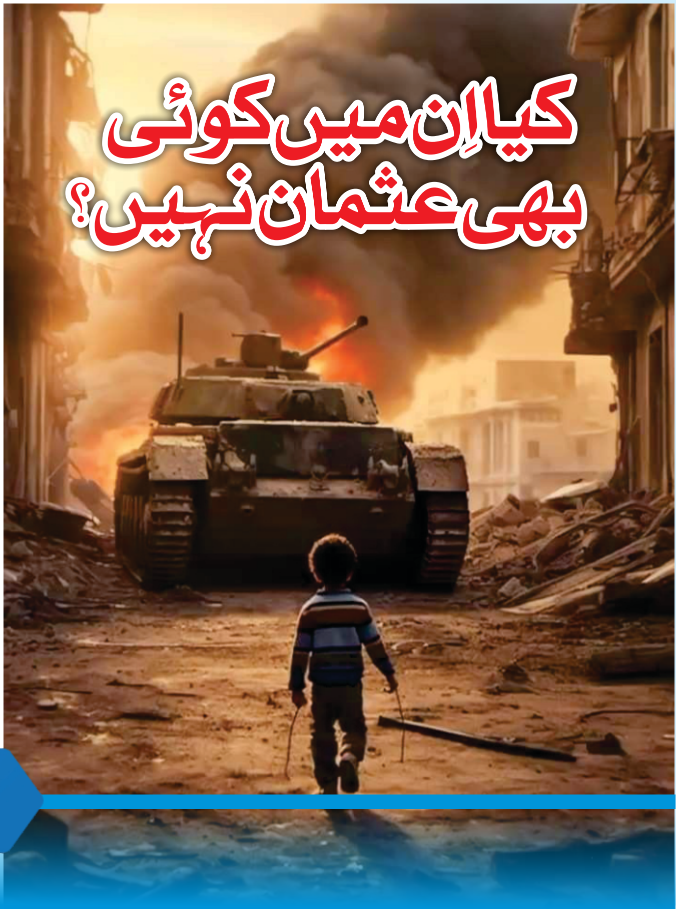

سعد حیدر

''ڈاکٹر صاحب! حقیقت یہ ہے کہ میرا بھی بہت دل چاہ رہا ہے کہ وہاں پہنچوں اور ان کے کسی کام آؤں مگر افسوس کی بات ہے کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر پایا۔ بس آپ مجھے کل صبح تک کا وقت دے دیجیے۔ میں آپ کو اپنا فیصلہ بتا دوں گا۔''

یہ کہہ کر سرجن ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے سلام کیا اور فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا، پھر سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

رات نے اپنے سائے اسلام آباد پر پھیلا دیے تھے اور ڈاکٹر عبداللہ اپنے پرائیویٹ اسپتال سے واپس گھر لوٹ رہے تھے۔ کئی روز سے مسلسل ایک کشمکش اور جنگ جاری تھی جس کا فیصلہ ہنوز نہ ہو سکا تھا۔ انھوں نے بدقت تمام اپنی سوچ کی لگامیں کھینچیں اور سوچ کی رَو کو گھر کی طرف موڑا جہاں اُن کی بہت محبت کرنے والی اہلیہ اور ایک نہایت خوب صورت لاڈلا بیٹا ان کا منتظر تھا۔ بے اختیار ان کے لبوں پر تھکی تھکی مسکراہٹ در آئی۔

ڈاکٹر عبداللہ طارق کا شمار پاکستان کے چوٹی کے سرجنوں میں ہوتا تھا۔ ان کے لکھے گئے ریسرچ پیپر بیک وقت کئی عالمی طبی رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ سرجری کرتے وقت کم سے کم کٹ لگاتے ہیں اور یہ بات ان کی اپنے شعبے میں مہارت پر دلیل تھی۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ایمرجنسی کیسز، جنھیں بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مشکل کہہ کر منع کر دیا، ڈاکٹر عبداللہ نے ان کی کامیاب سرجری کی اور اللہ تعالیٰ نے مریض کو شفا بخشی۔

پہل پہل تو شام کو کلینک کرنے کے ساتھ ساتھ صبح کے وقت ایک میڈیکل کالج میں پروفیسر کے طور پر پڑھاتے رہے، مگر جب پریکٹس بڑھتے بڑھتے کافی وقت لینے لگی تو انھوں نے کالج چھوڑ کر اپنا ایک پرائیویٹ اسپتال کھول لیا جس کا شمار اب اسلام آباد کے مہنگے مگر بہترین اسپتالوں میں ہونے لگا تھا۔ زندگی بہت ہی سکون کے ساتھ، عافیتوں کے سائے میں سبک رفتاری سے ایک لگے بندھے نظام الاوقات میں گزر رہی تھی اور بلاشبہ ڈاکٹر عبداللہ اپنی زندگی سے ازحد مطمئن تھے۔

آڈیٹوریم میں بتیاں بند تھیں۔ اسٹیج پر بڑا پردہ تنا ہوا تھا اور اس پر پروجیکٹر کے ذریعے ایک ویڈیو فلم دکھائی جارہی تھی۔ ویڈیو میں ایک شہر دکھایا جارہا تھا جو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کوئی عمارت ایسی نہ بچی تھی جو صحیح سالم دکھائی دے رہی ہو۔ ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ ایک قیامت صغریٰ تھی جس نے ہر طرف سے اس شہر اور اس کے باسیوں کو گھیر رکھا تھا۔ ویڈیو میں مناظر تیزی سے بدلتے جارہے تھے۔ ایک منظر میں تباہ حال مسجد دکھائی جا رہی تھی جس میں مؤذن کے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ مؤذن نے اذان دینے کے بعد، بڑے دلدوز انداز میں آسمان کی طرف اپنا منہ کر کے اللہ تعالیٰ کو پکارنا شروع کر دیا:

''اے رب! اب بس تو ہی ہے...... تیرے سوا ہمارا کوئی مددگار نہیں......''

مؤذن کی آواز میں اس شہر کے مسمار شدہ درودیوار کا گریہ شدت سے جھلک رہا تھا۔ منظر تبدیل ہوا۔ ایک برقع پوش خاتون تھیں جس نے اپنے زخمی معصوم بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ بچے کے ماتھے پر خون آلود کپڑے کی دھجی سی بندھی تھی اور وہ درد کی شدت کے باعث زاروقطار رو رہا تھا۔ اس کی ماں اشک بار آنکھوں کے ساتھ بآوازِ بلند مسلمانوں کو مخاطب کر رہی تھی اور انھیں مدد کے لیے بلا رہی تھی۔ منظر تبدیل ہوا۔ ایک اسپتال زخمیوں سے بھرا ہوا، انھیں سنبھالنے والے ڈاکٹروں اور پیرامیڈیکل اسٹاف کی تعداد انتہائی ناکافی۔ ایک ڈاکٹر کیمرے کے لینز پر نظریں جمائے بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے:

''ہمارے پاس مرہم پٹی کا سامان ختم ہو چکا ہے۔ اسپرٹ کی جگہ ہم سرکہ استعمال کر رہے ہیں۔ ہم پوری دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ہماری مدد کریں اور بالخصوص ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل اسٹاف سے اپیل کرتے ہیں کہ جلد از جلد یہاں آئیں اور زخمیوں کے علاج معالجے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔''

ویڈیو ڈاکومنٹری کے بعد ایک باریش خوب صورت نوجوان نے اسٹیج پر آکر بڑے پرسوز لہجے میں ایک نظم پڑھی، جس کے ایک بند نے اب اگلے دس دن تک تازیانہ بن کر ڈاکٹر عبداللہ کے دل و دماغ پر برستے رہنا تھا۔

☆......☆

پروگرام کے دس دن بعد:

اسپتال سے گھر تک کا سفر محض پچیس منٹ کا تھا مگر ذہنی دباؤ کی وجہ سے آج یہ فاصلہ انھیں گھنٹوں پر محیط لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر انھیں وہ مناظر یاد آرہے تھے جو انھوں نے دس دن پہلے پروگرام میں دکھلائی گئی ویڈیو میں دیکھے تھے، پھر اس نوجوان کا پرسوز انداز میں نظم پڑھنا اور نظم کا وہ بند جو اب تازیانہ بنے مسلسل ان کے دل و دماغ میں ایک زلزلہ برپا کیے ہوئے تھا۔

مصطفی کی امت کب سے سسک رہی ہے
کیا غیرتِ مسلماں ناپید ہو گئی ہے؟
ہر سمت خونِ مسلم
یہ تجھ سے پوچھتا ہے

جب بھی کبھی انھیں لگتا کہ بالآخر ان کی اپنے آپ کو دی گئی دلیلیں غالب آرہی ہیں یکدم غیرتِ مسلماں ناپید ہونے والا مصرع آندھی طوفان کی طرح آتا اور ڈاکٹر عبداللہ کی محنت سے کھڑی کی گئی خودساختہ دلائل کی عمارت کو تہ و بالا کر ڈالتا۔ انھوں نے اس ذہنی کشمکش سے تنگ آکر ذہنی رَو کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور سوچوں کے سرکش گھوڑے کو جیسے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ وہ چند ہی ساعتوں میں انھیں نوے کی دہائی میں لے گیا۔

تب وہ ایک پرجوش نوجوان ڈاکٹر تھے۔ نیا نیا MBBS ہوا تھا۔ جذبات آسمانوں کو چھوتے تھے اور امت کا درد دل کی گہرائیوں تک اترا ہوا تھا۔ ہر مسلمان کی تکلیف ان دنوں انھیں اپنی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ انہی دنوں بالکل ایسا ہی پروگرام، اسی مسلم رفاہی تنظیم نے بوسنیا اور کوسوو میں مسلمانوں کے قتلِ عام اور ان کی امداد کے موضوع پر منعقد کیا تھا۔ انھیں آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ تقاریر کے بعد جب اسٹیج سے اعلان ہوا کہ جو ڈاکٹر رضا کارانہ طور پر بوسنیا میڈیکل امدادی مشن پر جانا چاہتے ہیں وہ اسٹیج پر آجائیں اور اپنے آپ کو رجسٹر کروالیں تو جو نوجوان تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹیج پر چڑھا تھا، وہ خود تھے۔

مگر اب......؟ اب پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا تھا؟ جذبات ٹھنڈے اور ماند پڑ چکے تھے۔ پہلے اہل و عیال کی ذمے داریاں نہ تھیں، اب بیوی اور بیٹا بھی تھا۔ چلتا ہوا اور وقت مانگتا اسپتال تھا۔ اب کیسے......؟ ناممکن! میں فنڈز تو دے رہا ہوں، کیا یہ کافی نہیں؟

سوچوں کے سرکش گھوڑے نے انھیں لمحوں میں برسوں کا سفر طے کروا کر، دوبارہ ذہنی کشمکش کے میدان میں لا چھوڑا تھا۔ اب وہ تھے اور ان کے سود و زیاں کے حساب کتاب۔

ایسے میں ڈرائیور نے گھر کے دروازے پر پہنچ کر ہارن بجایا تو وہ بری طرح چونک گئے۔

☆......☆

''یوسف بیٹا! آج ہم سیرتِ نبوی میں صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کے بارے میں پڑھیں گے۔''

یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ یوسف کی عمر ویسے تو اب تیرہ سال ہو چکی تھی مگر اسے تب تک نیند نہ آتی جب تک اس کے ابو اسے سیرت سے ایک دو واقعات ترتیب وار نہ سنا لیتے۔ چھوٹی عمر سے کہانیاں سننے کے دیوانے، یوسف میاں کو جب سے سیرتِ نبوی کے تسنیم و کوثر کی چاشنی لگی تھی، تب سے اسے بس یہی سننا اچھا لگتا تھا۔

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ عمرہ فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ پندرہ سو جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا راستہ روکا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان سے مذاکرات کرنے مکہ مکرمہ بھیجا۔''

یوسف انتہائی انہماک کے ساتھ سیرت النبی کا واقعہ سن رہا تھا۔

''مشرکین مکہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس روک لیا۔ انھیں واپس مسلمانوں کے پاس آنے میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں۔''

''نہیں!'' یوسف کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کا چہرہ صحیح معنوں میں متفکر نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ کے لیے یہ بات نئی نہ تھی۔ انھیں یاد تھا کہ جب انھوں نے یوسف کو طائف کا واقعہ سنایا تھا تو وہ زاروقطار رونے لگ گیا تھا۔ پھر کتنے ہی دن یوسف کی اداسی نہ گئی

تھی، پھر جب غزوۂ بدر کا واقعہ سنا تو کتنے ہی دن اس کے خوش و خرم گزرے تھے۔
ڈاکٹر عبداللہ سیرت نبوی کے پلٹتے اوراق کے ساتھ جب اپنے بیٹے کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کرتے تو انھیں اپنی کم مائیگی کا بے حد احساس ہوتا۔ کہاں فطرت پر قائم معصوم بچے کے سچے جذباتِ ایمانی اور کہاں ان کے دل کی وہ بے حسی۔
''سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔''
یوسف کا چہرہ بھی فرطِ جذبات سے تمتمایا ہوا تھا اور ایسے لگتا تھا کہ جیسے ابھی تلوار سونت کر مشرکین مکہ پر تن تنہا پل پڑے گا۔
''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب مسلمانوں کو ایک درخت تلے جمع فرمایا اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے بیعت لی۔ یہی بیعت، بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اللہ رب العزت کو مسلمانوں کی غیرت و حمیت کا یہ اظہار اتنا پسند آیا کہ اس بیعت میں شریک تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنی رضا کا پروانہ عطا فرما دیا۔''
یوسف کا چہرہ جذبات سے معمور تھا۔ خود ڈاکٹر عبداللہ بھی بمشکل اپنے جذبات پر قابو رکھے ہوئے تھے۔ بار بار ان کے ذہن کے پردے پر یہ جملہ چمکتا تھا:
''ایک مسلمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے......''
اور ساتھ ہی ان ہزاروں مسلم بچوں، عورتوں اور مردوں کی لاشیں ان کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی جنھیں صیہونیوں نے آگ و بارود کی برسات کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔
وہ کافی دیر سے خاموش ایسی ہی سوچوں میں غلطاں تھے کہ انھیں یوسف کی پر جوش آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''ابو! میں نے بھی اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کرنی ہے!''
ڈاکٹر عبداللہ نے انگلیوں کی پوروں سے اپنے آنسو صاف کیے، پھر حیرت اور پیار کے ملے جلے جذبات میں گویا ہوئے: ''پیارے بیٹے! سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو خیر و عافیت سے مسلمانوں میں واپس لوٹ آئے تھے۔ وہ شہید تو نہیں ہوئے تھے اُس وقت۔ آپ نے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس بات پر بیعت کرنی ہے؟''
یہ بات سن کر یوسف پہلے تو یکدم ٹھٹک کر حیرت سے اپنے ابو کو تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں:
''ابو! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم؟''
پھر کچھ لمحے توقف کے بعد وہ جوش و خروش کے عالم میں لیپ ٹاپ کھول کر ایک ویڈیو کھولنے لگا۔ ڈاکٹر عبداللہ کی ساری توجہ اب لیپ ٹاپ اسکرین پر مرکوز تھی۔ ویڈیو چلنا شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی یوسف کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہی تباہی کا منظر پیش کرتا غزہ کا شہر تھا اور معصوم بچوں اور عورتوں کے لاتعداد لاشے سڑکوں پر بے گور و کفن پڑے تھے۔
یوسف رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوا:
''ابو! کیا ان میں کوئی بھی عثمان نہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا نام بھی عثمان نہیں؟''
یوسف کی والدہ دروازے پر کھڑی باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں اور اپنے شوہر کے ذہن میں کچھ دن سے برپا ذہنی کشمکش سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ اپنے شوہر کو مخاطب کر کے گلوگیر لہجے میں بولیں: ''کیا ان میں سے کوئی بھی آپ کا یوسف نہیں؟''
اس لمحے ڈاکٹر عبداللہ کا حال اس شخص کی طرح ہوا جو غنودگی میں ہو اور اس پر ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اچانک انڈیل دی گئی ہو۔ یوسف اور اس کی امی کی بات سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھیں ایسا لگا کہ جیسے ان کے ذہن سے یکدم منوں بوجھ اتر گیا ہو، دل کا زنگ دور ہو گیا ہو، ایک سکینت سے طاری ہو گئی ہو اور وہ لمحہ تھا کہ جب ان کے لیے فیصلہ کرنا بے حد آسان ہو گیا۔ انھیں اب غزہ کی بستی میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ بے ساختہ انھوں نے اپنے پیارے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور اس کے کان میں کپکپاتی آواز میں سرگوشی کی: ''ہاں بیٹا! یہ سب ہمارے عثمان ہیں اور ہم انھیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑیں گے......!''

☆☆☆

مسکراہٹ کے پھول

سویرا قائم خانی۔ ملتان

کیا زمانہ آ گیا ہے؟

ایک دوست: ''تربیلا ڈیم اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کے پانی سے بجلی بنائی جا سکے۔''
دُوسرا دوست: ''کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ایک پانی ہی خالص رہ گیا تھا، اس میں سے بھی بجلی نکال لی۔''

خالی جگہ:

ایک دوست نے دُوسرے سے پوچھا: ''یہ کیا ماجرا ہے کہ جب میں اُلٹا کھڑا ہوتا ہوں تو میرے جسم کا خون میرے سر میں جمع ہو جاتا ہے اور جب میں سیدھا کھڑا ہوتا ہوں تو پاؤں میں جمع کیوں نہیں ہوتا۔''
دُوسرے دوست نے بڑی عقل مندی سے جواب دیا: ''جو جگہ خالی ہو گی، خون وہیں تو جمع ہو گا۔''

گھر کی چابی:

دو دوست کسی عمارت کی اٹھارویں منزل پر رہتے تھے۔ ایک دن وہ گھر آئے تو معلوم ہوا کہ بجلی بند ہے، لہٰذا لفٹ نہیں چل سکتی۔
دونوں نے کہا: ''سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بہت تھک جائیں گے۔''
ایک نے کہا: ''چلو باتیں کرتے ہوئے چلتے ہیں۔''
پہلے نے کچھ مزاحیہ واقعات سنائے اور بولا: ''سولھویں منزل آ گئی، اب تم سناؤ۔''
دُوسرا بولا:
''واقعہ دردناک ہے۔ تم رو پڑو گے۔''
پہلے نے کہا: ''نہیں، میں نہیں روؤں گا، تم سناؤ تو سہی۔''
دُوسرا بولا: ''تو سنو......! گھر کی چابی نیچے کار میں ہی رہ گئی ہے۔''

شیخی خورے:

ایک دوست: ''میرے پردادا مکا مار کر دیوار توڑ دیتے تھے، سومنات کا مندر توڑنے میں وہ بھی شامل تھے۔''
دُوسرا دوست: ''میرے پردادا جب غمگین انداز میں نشید پڑھتے تھے تو لوگوں کے آنسوؤں کی وجہ سے جھیلیں بن جاتی تھیں، سیف الملوک جھیل اسی وجہ سے بنی۔''
تیسرا دوست: ''یہ تو کچھ بھی نہیں، میرے پردادا کو غلیل چلانے کا شوق تھا۔ وہ چاند پر نشانے لگاتے تھے۔ چاند پر جو گڑھے ہیں، انھوں نے ہی تو ڈالے ہیں۔''

ڈش کلینر:

ایک دوست نے دُوسرے سے پوچھا: ''بھئی تمھارا بیٹا انگلینڈ میں کیا کام کرتا ہے؟''
دوسرے نے جواب دیا: ''وہ انگلینڈ میں D.C ہے۔''
پہلا حیرت سے: ''ایک پاکستانی انگلینڈ میں D.C کیسے ہو سکتا ہے؟''
دوسرے نے جواب دیا: ''بھئی D.C کا مطلب ہے ڈش کلینر۔''
☆...... جیسے ہی میں شادی ہال میں داخل ہوا، ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی وضع قطع، بول چال اور اخلاق انتہائی متاثر کن تھا۔ میں متاثر ہونے ہی لگا تھا کہ اتنے میں آواز آئی کھانا کھل گیا۔ بس پھر!!!

☆☆☆

میرِ حجاز

اختر حسین عزمی

دو اڑھائی مہینے میں ہی اپنے گھر، حویلیاں اور جمے جمائے کاروبار اور برادریاں چھوڑ کر صحابہ آہستہ آہستہ اپنے اپنے حالات کے موافق یثرب کی طرف ہجرت کرنے لگے۔

حضرت عمر بن خطاب کے بڑے بھائی زید بن خطاب، بہنوئی سعید بن زید، داماد خنیس بن حذافہ، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن ام مکتوم، بلال بن رباح، سعد بن ابی وقاص، سالم بن معقل، عمار بن یاسر، طلحہ بن عبیداللہ، حمزہ، مرثد اور ابومرثد اور عثمان بن عفان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یثرب پہنچ گئے۔

بنی مظعون، بنی البکیر اور بنی جحش تین خاندان اپنے بیوی بچوں، بھائی بہنوں سمیت اپنی بھری حویلیوں کو خالی چھوڑ کر اللہ رب العزت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں ہجرت کر گئے۔

ابوجہل ان کے سنسان گھروں کے پاس سے گزرا تو کہنے لگا:

''یہ سب ہمارے چچا زاد کا کیا دھرا ہے جس نے ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے پھاڑ کر رکھ دیا۔''

یہ قریش اور خصوصاً ابوجہل کی ہٹ دھرمی اور ظلم تھا جس کے باعث مسلمان اپنے خاندانوں اور حرم مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن وہ اُلٹا اس قطع رحمی اور خاندانی خلفشار کا الزام پیغمبرِ اسلام کو دے رہا تھا۔

☆☆

اب مکہ میں صرف وہ مسلمان رہ گئے تھے جو اپنے خاندانوں کے شکنجے میں سے نکلنے کی قدرت نہ رکھتے تھے یا جنھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روکا ہوا تھا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ ہجرت کی تیاری شروع کر دی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ کچھ دنوں کے لیے توقف کرو، مجھے توقع ہے کہ ہجرت کی اجازت مجھے بھی مل جائے گی۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''کیا واقعی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کی توقع ہے؟ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

یہ ارشاد سن کر حضرت صدیق اکبر کو امید ہوگئی کہ انھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ نصیب ہوگا۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے خیال سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دو اونٹنیوں کو جو ان کے پاس تھیں، چار ماہ تک کیکر کے پتے کھلا کر تیار کرنے لگے۔ (صحیح البخاری)

☆☆

خانہ کعبہ کے کلید بردار بنی عبدالدار تھے۔ ان کی روایت تھی کہ وہ سوموار اور جمعرات کو کعبے کا دروازہ کھولا کرتے تھے۔

اللہ کے رسول کو کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ ہجرت ملنے کی اُمید تھی، پھر نجانے کب بیت اللہ دیکھنا نصیب ہو سو انھوں نے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے دروازہ کھولنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے بڑی بے مروتی سے آپ کے لیے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا، لیکن آپ نے برہم ہونے کی بجائے حلم و بردباری سے کہا:

''اے عثمان! یاد رکھو ایک دن آنے والا ہے جب تُو دیکھے گا کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا اسے عطا کروں گا۔''

یہ سن کر عثمان بن طلحہ نے کہا: ''کیا قریش اس وقت اتنے ذلیل و رُسوا ہو چکے ہوں گے کہ اتنا بڑا انقلاب آجائے گا؟''

''اے عثمان! اس روز قریش ذلیل نہیں بلکہ حقیقی عزّت و شوکت سے ہمکنار ہوں گے۔'' یہ بات عثمان بن طلحہ کی لوحِ قلب پر نقش ہوگئی۔ اسے یہ یقین سا ہو گیا کہ محمدؐ جو کہتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے۔

☆☆

خونی سازش:

صبح سے دارالندوہ میں غیر معمولی گہما گہمی تھی جو اس بات کا اظہار تھی کہ قریش کسی اہم ترین فیصلے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔

دارالندوہ کی تعمیر ڈیڑھ صدی قبل قریش کے جد قُصی بن کلاب نے کی تھی۔ اس وقت سے قریش کے مشترکہ فیصلے اسی مرکزی چوپال میں طے ہوتے تھے۔

آج کے اجتماع کے انتظامات میں ابوجہل عمرو بن ہشام پیش پیش تھا۔ اگرچہ اس اجتماع میں چالیس سالہ بالغ نظر افراد کو ہی شرکت کی اجازت تھی لیکن ابوجہل کو اس کی کم عمری کے باوجود اس اجتماع میں شرکت کی خصوصی اجازت تھی، کیونکہ آبائی دین کے تحفظ کے لیے جتنا بڑھ چڑھ کر اس نے کردار ادا کیا تھا، کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی عقل و ذہانت کے باعث قوم میں ابوالحکم کے نام سے جانا جاتا تھا، اگرچہ اس کی ہٹ دھرمی کے باعث پیغمبرِ اسلام نے اسے ابوجہل کا لقب دیا تھا۔

مسلمانوں کے مکے سے یثرب ہجرت کر جانے سے بہت سے قریش نے آسودگی محسوس کی کہ چلو روز روز کی کل کل اور سردردی ختم ہوئی لیکن یہ ابوجہل تھا جس نے سردارانِ قریش کو اس بارے میں فکرمند کیا کہ مسلمانوں کے یہاں سے چلے جانے سے بلا ان کے سر سے ٹلی نہیں بلکہ یہ ہجرت قریش کی سیادت اور ان کے تجارتی مفادات کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر دوسرے مسلمانوں کی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تو اہل یثرب کو ایک ایسی قیادت میسر آجائے گی جو اپنی قوتِ تاثیر اور مقناطیسی شخصیت سے ان کو ایک ایسا جتھا بنا دے گی جسے سنبھالنا قریش کے بس سے باہر ہوگا۔ قریش کے خوش حال گھرانوں کے جوان محمدؐ کی شیفتگی میں تمام تر سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہیں تو اوس و خزرج کے وہ جوان جن کا شیوہ ہی جنگ آزمائی ہے، وہ محمدؐ کے پیغام کی تاثیر سے اپنے دشمنوں کے لیے کیا کم خطرناک ہوں گے۔

عین ممکن ہے کہ مکے سے شام کی طرف جانے والی وہ تجارتی شاہراہ جو یثرب سے گزرتی ہے، قریش پر بند کر دی جائے جبکہ مکے والے اکیلے اس شاہراہ کے ذریعے ملک شام سے اڑھائی لاکھ دینار سونے کی مالیت کی سالانہ تجارت کرتے ہیں۔ اس شاہراہ پر اہل یثرب کا کنٹرول گویا ہماری شہ رگ پر ان کا ہاتھ ہوگا۔

(جاری ہے)

وہ شخص ہمت اور حوصلے کا پہاڑ تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد پاکستان کے نوجوانوں کو مضبوط بنانا تھا۔ دینی مدرسے کا ایک طالب علم اتفاق سے اُس تک جا پہنچا، یوں شوق لگن، جدوجہد اور عزم کے رنگین جذبوں سے سجی داستان زیبِ قرطاس ہوئی!
ایک ایسے شخص کا تذکرہ جو دولت پر فن کو ترجیح دیتا تھا......!

ہمّت کا پہاڑ ۳

تحریر: رشید احمد منیب
راوی: سبحان انعام اللہ خان مرحوم

عید گزری، پھر بہت سے دن گزر گئے، میں کلب جا ہی نہ سکا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ سی ہان نے مجھے یاد کیا ہے۔ تعجب ہوا کہ ایک عقاب کو مٹی کا پرندہ کیوں یاد رہا؟

میں کلب چلا گیا۔ دیکھا تو انھوں نے ڈاڑھی ایک مشت بڑھا لی تھی۔ سر پر ٹوپی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ دیکھنے میں وہ اچھے خاصے ''بزرگ'' لگ رہے تھے۔ کہنے لگے: ''کتاب کا تحفہ بہت پسند آیا۔''

اُس کے بعد اُن سے میرا تعلق بڑھتا چلا گیا۔ دور سے وہ میرے لیے ایک سنگلاخ پہاڑ کی طرح تھے۔ قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا، اُن کے دامن میں تو شگفتہ پھولوں کا ایک باغ بھی ہے۔ ایک دن فرمائش کر کے گھر تشریف لائے۔ دعوت اڑائی۔ ابو جی سے مل کر کہنے لگے:

''میٹھے گوشت کا شوربا بھی میٹھا ہوتا ہے۔''

گھر کی ایسی ہی ایک محفل میں برادر کبیر مولانا محمد اسماعیل ریحان سے بھی اُن کی دوستی ہو گئی، پھر تو دوستی کا یہ سلسلہ چل ہی نکلا۔

اُن دنوں میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ایک دن میں سی ہان کا انٹرویو بھی لوں گا۔

☆......☆

مدرسے میں پڑھائی جاری رہی۔ میں ہفتے میں دو دن کلب بھی جاتا رہا۔ سی ہان سے تعلق بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے دو تین مُکے چلانا سیکھ لیے تھے، ایک آدھ لات بھی چلا لیتا۔ میں کلب کے لڑکوں میں سب سے نکما اور نالائق تھا لیکن سی ہان حوصلہ افزائی کرتے رہتے اور کہتے: ''تم سیکھ سکتے ہو......!''

اور میں ٹوٹی پھوٹی محنت جاری رکھتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ چند مُکے اور لاتیں گھمانے کے بعد اب گلی، محلے کے لڑکوں سے الجھنے کا وہ خیال جو چند سال قبل دینی غیرت کے نام پر دماغ پر سوار رہتا تھا، ہوا میں اڑ گیا تھا۔ اب گلی محلے کی لڑائی ایک فضول بات لگتی تھی، لیکن لڑائی کا پہلا تجربہ ہوا بھی تو کس کے خلاف؟

ایک پولیس والے کے خلاف......!

ایک دن میں محلے کی مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔ دروازے ہی پر ایک شخص کو اپنے بڑے بھائی سے الجھتے ہوئے پایا۔

اُس نے ریس والے موٹر سائیکل کے ہینڈل کی طرح اوپر کی جانب اٹھی ہوئی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ وہ ایک گیلن میں پانی بھر کر مسجد سے لے جا رہا تھا۔ شاید اُس کی چپل کوئی چور لے گیا تھا، اُس کے بدلے میں وہ ایک بچے کے چپل لے جانا چاہتا تھا۔ قریب ہی ایک غریب بچہ پریشان کھڑا تھا۔ میرے بھائی مونچھوں والے کو سمجھا رہے تھے کہ یہ بچہ چور نہیں ہے، تم اُس کے چپل واپس کر دو، لیکن وہ بضد تھا کہ چپل نہیں دوں گا۔

میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا، کیوں کہ بڑے بھائی موجود تھے اور میرا کوئی کام نہیں تھا۔ مسجد کی سیڑھیوں سے اوپر جاتے ہوئے اتفاق سے میری نظر دروازے کی جانب گئی تو دیکھا کہ وہ مونچھوں والا ایک ہاتھ میں گیلن بلند کر کے بھائی پر وار کرنے والا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے غصے کی وجہ سے شعلے نکل رہے تھے اور چہرے پر گویا نفرت رقص کر رہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی گویا دماغ میں کوئی پنکھا سا چل پڑا۔ میں پلٹ کر اتنی تیزی سے سیڑھیوں پر دوڑا کہ کبھی سڑک پر بھی کیا بھاگا ہوں گا۔

دوڑتے ہوئے میں بھائی کی اوٹ سے یکلخت نمودار ہوا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ کا ہک نما پنچ اُس گیلن اٹھائے شخص کے جبڑے پر پڑا۔

بس یہ ایک ہی لمحے کی بات تھی۔ گیلن بردار شخص تیورا کر زمین پر جا گرا، لیکن صرف گرا ہی نہیں، بلکہ زمین پر دو تین لڑھکنیاں بھی کھا گیا۔ گیلن اُس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ بچے کی چپلیں اُس کے پیروں سے نکل گئیں۔ وہ تین لڑھکنیاں کھانے کے بعد اٹھا، لیکن اس کی اٹھی ہوئی مونچھیں منہ پر اب پونے تین کی بجائے ایک بج کر پینتیس منٹ کا اعلان کر رہی تھیں۔ جبڑے پر ڈنٹ پڑ گیا تھا اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔

اُس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

میں اسے مزید دھونے کے خیال سے آگے بڑھا لیکن بھائی نے مجھے روک دیا۔ وہ بمشکل ہنسی ضبط کر رہے تھے۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے، اتنی تیزی سے آ کر اسے مار بھی دیا، پیچھے ہٹو، وہ پولیس والا ہے، ابھی پورے تھانے کی فورس لے آئے گا۔''

یہ سن کر توجہ اس تیز رفتار حملے کی جانب گئی جو موصوف نے انجام دیا تھا۔ خیال گزرا یہ غلط ہو گیا ہے لیکن پھر خیال آیا کہ غلطی تو اسی کی تھی، یہ کیوں کسی غریب بچے کی چپل لے جا رہا تھا، پھر میرے بھائی پر یہ ہاتھ بھی اٹھا رہا تھا، کیوں؟ کیا اُسے قانون نے اِس بات کی اجازت دے رکھی ہے؟''

یہ خیال آتے ہی میں پھر سے شیر ہو گیا اور سوچا کہ اسے دو تین اور لگاؤں، لیکن بھائی نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

پھر بھائی نے اُسے کہا: ''تم کیسے پولیس والے ہو؟ تمھیں شرم نہیں آتی؟ تم نے بچے کے چپل چھینے اور ایک نمازی پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی، تم جیسے لوگ محکموں کو بدنام کرتے ہیں، ابھی ایک لڑکے نے مارا ہے، سب مسجد والے مل کر ماریں گے تو تمھیں پتا چل جائے گا۔ اب جاؤ یہاں سے، اور تھانے سے فورس لے کر آؤ، ایس ایچ او کو بتا دینا کہ میں جس مسجد سے پانی بھرتا ہوں، اُسی کے ایک نمازی بچے کی چپلیں چرانے پر مجھے مار پڑی ہے، چلو جاؤ، میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔''

پولیس والا اٹھا اور خاموشی سے چلا گیا، مگر پھر لوٹ کر واپس نہ آیا۔

میں نے خود کو سمجھایا کہ غصے میں بھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے لیکن اس کے باوجود کچھ مواقع ایسے ضرور آئے، جب نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھوں اور پیروں کا استعمال کرنا پڑا اور ہر مرتبہ حیرت انگیز نتیجہ نکلا۔

دوستو! یہ ہاتھ اور پیر اُسی وقت ساتھ دیتے ہیں جب دماغ میں کچھ طاقت ہو اور جب دل میں کچھ ہمت اور حوصلہ ہو۔ کلب کا سب سے نالائق لڑکا آج اتنے برسوں بعد سوچتا ہے کہ یہ سب اُس استاد کی نظرِ کرم کا اثر تھا جس نے کہا تھا کہ ''میں کبھی حوصلہ نہیں ہارا، اس لیے میں کبھی نہیں ہارا!'' حتیٰ کہ انتقال سے چند لمحے قبل، اسپتال میں اسٹریچر پر موجود سی ہان کی نبضیں جب ڈوب چکی تھیں، آنکھیں بند ہو چکی تھیں، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور وہ رضا اللہ خان اور شجاعت اللہ خان کو بتا رہے تھے کہ یہ فوت ہو چکے ہیں۔ استاد نے آخری مرتبہ ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا تھا کہ وہ زندگی ضرور ہار رہے ہیں لیکن امید اور حوصلہ نہیں۔

یہ امید، حوصلہ اور ہمت سی ہان کی زندگی سے سب سے زیادہ سیکھنے والے شے ہے جس کی آج کے نوجوانوں کو اشد ضرورت ہے۔ میں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے ظرف کے مطابق یہ چیز سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر چہ میں اس میں مکمل کامیاب تو نہیں ہوا، لیکن نا امید بھی نہیں ہوا۔ یہی چیز آپ بھی سیکھ سکتے ہیں، کم از کم سمجھ تو سکتے ہیں۔

انتقال سے تین یا چار سال قبل ہی سی ہان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت تیزی سے قریب آ رہا ہے۔ وہ نماز ہمیشہ پہلی صف میں ادا کرتے تھے۔ تہجد اُن کی سفر میں بھی کم ہی قضا ہوتی تھی۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اُن کا فن مدرسے کے طلبہ بھی سیکھ لیں اور میں قدرت کے اِس کھیل پر حیران ہوتا تھا کہ کیسے اُس نے مجھے سی ہان تک پہنچا دیا؟

انھی دنوں کی بات ہے کہ سی ہان نے ایک مظاہرے کے دوران میں لکڑی کا چار انچ موٹا بلاک ہتھیلی سے توڑ کر سب کو حیران کر دیا۔ جوانی میں تو وہ برف کی سات یا آٹھ سلیں بھی ہتھیلی سے توڑ چکے تھے۔ بیس بال کا بلا، ناریل، پہاڑی پتھر اور لکڑی کے دو، دو انچ موٹے کئی تختے ایک ہی وار سے توڑنا اُن کے لیے بچوں کا کھیل تھا، لیکن بڑھاپے میں بھی یہ ہمت، بہر حال ایک کمال ہی تھا۔

اُس وقت میں روزنامہ اسلام سے وابستہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہمت کے اِس پہاڑ سے کچھ باتیں خاص طور پر کی جائیں اور انھیں شائع کیا جائے تا کہ نوجوان اُن کی شخصیت سے کچھ تو سیکھ ہی لیں۔

سو اگلی سطور میں سی ہان کی گفتگو اور اُن کی باتیں انھی کی زبانی آپ کو بتائی جا رہی ہیں۔

اسی لیے اب آگے اِس داستان کے حقیقی راوی کے قصے انھی کی زبانی رقم کرتا ہوں۔

پڑھیے اور سیکھیے کہ۔

ہو حلق یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(جاری ہے)

☆☆☆

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

☆ شمارہ ۱۰۹۸ سامنے ہے۔ سرورق تو عجیب سا ہے۔ القرآن الحدیث کے بعد دستک پڑھ کر بہت بہت خوشی ہوئی۔ عشرت جہاں کی 'ذکر ایک رات کا' عجیب سی تھی۔ اگلے دونوں صفحوں پر اپنی پسندیدہ لکھاری رفعت سعدی اور حافظ عبدالرزاق خان کی تحریریں دیکھ کر بہت بہت بہت خوشی ہوئی۔ ''تمھیں اب وقت ہی سکھائے گا'' پڑھ کر سچ میں رونا آ گیا۔ 'بوسہ جدائی' میں حافظ صاحب ہمارے بھکر میں گھومتے نظر آئے۔ حافظ صاحب اس مرتبہ آمنے سامنے میں حبیبہ نور اور ہادیہ مناہل کے ساتھ آئے تو اگلی مرتبہ فاطمۃ الزہرا، عافیہ ردا، قرۃ العین کے ساتھ آئیے گا۔ (ام محمد حنظلہ۔ بھکر)

ج: وہ حنظلہ کے لیے پرمزاح کہانی تھی ناں اور آپ تو حنظلہ کی امی جان ہیں، اس لیے آپ کو تو عجیب لگنی ہی تھی۔

☆ گزشتہ دنوں ایک تحریر پڑھی تھی۔ 'وقت لگتا ہے' از محمد عالم میواتی دل کو چھو گئی۔ واقعتاً بہت وقت لگتا ہے۔ ہم تقریباً دو، اڑھائی سال میں صرف چھے تحریریں ہی شائع کروا پائے مگر ہم نے صبر کی بکل مارے رکھی تھی۔ صرف پچھلے دنوں صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور چھلک پڑا (وہ بھی ہمارے کارفرماؤں کی وجہ سے کہ اب تو تمھاری کوئی تحریر ہی شائع نہیں ہوتی) اور ہم شکوہ کر بیٹھے۔ خیر ہم تبصرہ کرنے چلے تھے شمارہ ۱۰۹۸ پر۔ مختار احمد کی 'ایمانی خوشی' نے واقعتاً ہمیں بھی خوش کر دیا۔ رفعت سعدی کی 'تمھیں وقت سکھائے گا' افسردہ کر گئی۔ 'بوسہ جدائی' آنکھوں کو نم کر گئی۔ 'میر حجاز' اور 'ان کے کوچے میں' ان کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ 'آمنے سامنے' کی محفل میں پہنچے تو کھل اٹھے کہ وہاں ہمارا نام بھی جگمگا رہا تھا۔ چچا جان ہر خط کے نیچے جواب دینے والی روایت بہت اچھی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہیے گا کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ جواب کے نظر آنے سے خط میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اگر چہ ہمیں یہ شمارہ سوگواری میں لپٹا محسوس ہوا تھا مگر ہمارے خط کی اشاعت نے سوگواریت دور کر دی۔ آپ کی 'دستک' نے ہمارا بھی دل للچا دیا۔ (انیسہ عائش۔ کوٹ رادھا کشن، قصور)

ج: ویسے بچوں کا اسلام اور خواتین کا اسلام میں الحمدللہ ثم الحمدللہ اچھا لکھنے والوں کی اچھی اچھی تحریروں کا بھی اتنا ازدحام ہوتا ہے کہ کبھی تو ان کی تحریر کی باری بھی سال کے بعد آتی ہے۔ ایک سال کا تجزیہ جو عموماً سال کے بعد شائع ہوتا ہے، غور سے پڑھیں تو انکشاف ہوگا کہ بظاہر بہت زیادہ چھپنے والے لکھاریوں کی بھی سال میں بارہ سے زیادہ تحریریں نہیں ہوتیں۔ آپ میں تو ماشاءاللہ لکھنے کی بہت اچھی اور فطری صلاحیت ہے۔ بس ایک تو مستقل اور مختصر لکھنے کی کوشش کیجیے، دوسرے کہانیوں کی بجائے اپنی اردگرد کی زندگی سے کسی واقعے کو چن کر اسے اپنے اسلوب میں قیدِ تحریر کیجیے۔ جیسے آپ نے اذان والی تحریر لکھی تھی۔ عام طور پر لکھاری کہانی زیادہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ حقیقت کسی بھی کہانی سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے اور اچھی کہانی لکھی بھی کبھی کبھی ہی جاتی ہے۔

☆ شمارہ ۱۱۱۴ موصول ہوا۔ 'بچوں کا اسلام' کے اس محل میں ہم حسبِ معمول 'پائیں باغ' سے داخل ہوئے۔ کوئی 'آمنے سامنے' نہ ہوا تو فوراً 'باب فیصل' پر پہنچے کہ ان کی مدھر 'دستک' سنیں مگر یہ کیا اس دروازے پر تو کوئی 'ابو احمد' کے پردے میں چھپا ایک اہم اور دل نشین تحریر لیے ہوئے تھا۔ 'گیارہویں سنچری' بچوں کا اسلام کا جائزہ متاثر کن رہا۔ ماشاءاللہ محنت اور عرق ریزی کام میں نظر آ رہی ہے۔ 'اونٹ رے اونٹ' اشتیاق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کیا کہنے، حال ہی میں جیل لائبریری سے اُن کا ناول 'سازش کا اژدھا' مل گیا۔ کمال لکھا ہے ماشاءاللہ۔ 'میر حجاز' ایک ایسا پاکیزہ نورانی سلسلہ ہے جو قلب و روح کو جلا بخشتا ہے۔ 'وہ بچہ کہاں گیا' احمد حاطب صدیقی صاحب ماشاءاللہ حسبِ سابق بہترین تحریر۔ جاوید بسام صاحب کے تخیل کی پرواز ماشاءاللہ بہت شان دار ہے۔ حافظ عبدالرزاق صاحب کی 'اعتراف' فلسطین کے موضوع پر شائع ہونے والی اب تک کی بہترین تحریر رہی۔ بچوں کا اسلام کے لکھاریوں میں سے اگر کسی کا انٹرویو مستقبل قریب میں شائع ہو تو وہ ہماری رائے میں حافظ صاحب ہی کا ہونا چاہیے۔ یہاں ایک ساتھی اسد علی حافظ صاحب کے بہت مداح ہیں۔ اگر چہ پورا

شمارہ بہترین تھا مگر آمنے سامنے کی کمی تشویش کا باعث ہوئی۔ بچوں کا اسلام میں 'آمنے سامنے' اور 'دستک' کی بہت اہمیت ہے۔ اگرچہ اُن کا ناغہ مجبوراً ہی کیا جاتا ہے، پھر بھی پسند نہیں۔ باتوں ہی باتوں میں قارئین کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے اور کئی بار تو ہمیں کھل کھلا کر ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم الحمدللہ یوں بھی خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تسلیم ورضا کا تقاضا ہے لیکن آمنے سامنے میں استفسارات اور جوابات، مزید تفریح کا سامان بنتے ہیں۔ (طاہر رشید)

ج: اللہ جل شانہ آپ سمیت تمام بھائیوں کے ساتھ آسانی عافیت کا معاملہ فرمائے، آمین! کوشش ہوتی ہے کہ دونوں سلسلوں کا ناغہ نہ ہو، پھر بھی کبھی رہ جاتے ہیں۔ حافظ صاحب کا انٹرویو ہمارے خیال میں پہلے دور میں ہو چکا ہے۔

☆ 'دیر نہیں لگتی' کاوش صدیقی صاحب کی اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کا درس دیتی خوب صورت کہانی ہے۔ 'ڈاکٹر نوید احمد کی یاد میں' پڑھ کر بے حد افسوس ہوا کہ آشیانہ اشتیاق احمد کا ایک اور چراغ اچانک ہی گل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ 'ماں' بڑی غمگین تحریر ہے۔ 'پلاسٹک کی کہانی' معلوماتی کہانی ہے۔ 'وقت بتائے گا' راقمہ نے اپنے مخصوص انداز میں بہت خوب لکھی۔ 'بلی اور ہم' ہنستی مسکراتی کہانی سامنے آئی۔ آمنے سامنے کی مجلس میں بارہ خطوط مع جواب پڑھ کر مزہ آ گیا۔ (مختار احمد۔ ملتان)

ج: ان دنوں تو آپ کی گیارھوں سنچری پر تبصرے آرہے ہیں، یقیناً زیادہ لطف لے رہے ہوں گے۔

☆ ڈھائی مہینے کی مسلسل غیر حاضری کے بعد ایک دفعہ پھر سے حاضر ہوں۔ شمارہ ۱۱۱۵ میں 'وہ بچ گیا کہاں؟' سلام کی برکت پر مبنی بہت اچھی تحریر تھی۔ 'گیارھویں سینچری' جب پوری ہو جائے گی تب پڑھوں گی۔ آگے صفحہ پلٹا تو اچانک منہ سے نکلا 'ہائیں' کیونکہ 'ایک ہنستے بستے گھرانے کی روداد' پر آپ نے جو تصویر لگائی ہوئی تھی، اس میں ایک بچے کا بازو ہی الٹا لگا ہوا تھا اور دوسرے بچے بے چارے کا آدھا بازو کہنی سمیت غائب تھا۔ رضوانہ سید علی کی 'بھیس' میں پڑھ کر خوف کی اور سردی کی لہر جسم میں دوڑ گئی کیونکہ میں دروازے کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میرا سوہنا شہر بہاول پور بھی بہت اچھا تھا۔ اچھا مدیر چاچو! ساریہ، خنساء اور جمانہ بہنا کو سلام۔ (شہزین عبدالستار۔ ڈسکہ)

ج: بھتیجی صاحبہ! سمجھا کیجیے ناں، ایسے اول فول گھرانے کے بچے اور ان کے لباس ایسے اول فول ہی ہو سکتے ہیں!

☆ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ میں تیئس سال سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں مگر یہ میرا پہلا خط ہے۔ میکے میں مستقل رسالے آیا کرتے تھے پھر میری شادی ہوگئی لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے میری امی جان کو جو رسالے اکٹھے کرکے رکھتی رہتی ہیں جب بھی کوئی وہاں جائے یا خود آئیں تو لے کر آجاتی ہیں وہ دن سب سے خوشی کا ہوتا ہے۔ اکٹھے نو رسالے جو ملتے ہیں۔ شمارہ ۱۱۰۹ میں سب سے پہلے دستک میں اسامہ سرسری بھائی کا آسان علم دین کورس کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ پاک انھیں استقامت نصیب فرمائے، آمین۔ سانحۂ ارتحال پڑھ کر خیال آیا کہ ٹھیک آٹھ سال پہلے میرا پیارا بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کو پیارا ہوگیا تھا۔ ۱۵ نومبر بروز اتوار میں ڈاکٹر (ابوجان) سے بیٹے کو ٹیکہ لگوانے گئی تو رسالہ بھی لے آئی اور رات کو جب پڑھ رہی تھی تو میرا آٹھ ماہ کا بیٹا میرے ہاتھ سے رسالہ چھین کر اپنے منہ میں لے کر چوسنے لگا۔ میں نے دل میں دعا کی کہ اللہ پاک میرے بچے کو دین کی خدمت اور علماء کی محبت نصیب فرمائے اور اگلی صبح میرے بیٹے کا بلاوا آ گیا اور ۱۷ نومبر کو محترم اشتیاق احمدؒ کی وفات کی خبر ملی۔ 'اپنا گھر' علی اکمل تصور بھائی نے کمال کر دیا۔ واقعی انسان کمزور نہیں ہوتا۔ اس کی قوتِ ارادی اسے کمزور بناتی ہے۔ پڑھ کر واقعی یہ احساس ہوا کہ یہ سچی کہانی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو ہر وقت بتاتی ہوں کہ کوشش کرنے والوں کی ہار نہیں ہوتی ماشاءاللہ پانچ سال کا ہوگیا ہے۔ میں نے ایک دن عظیم فاتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کہانی سنائی تو پوری کی پوری اپنے بابا کو سنائی اور کہنے لگا میں عمر ہوں میں بہادر بچہ ہوں میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ سلسلہ وار 'میر حجاز' ایسا روح کو جلا دینے والا سلسلہ ہر ہفتے نئی تازگی مہیا کرتا ہے دعا ہے اختر حسین عزمی کی صحت وسلامتی کے لیے اور یہ کہ یہ سلسلہ کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔ پروفیسر اسلم بیگ کی پہلی جھلک زبردست رہی واقعی محترم اشتیاق احمد کی شخصیت ہر دلعزیز رہی۔ محترم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو ہر وقت قارئین کے دل میں بستے ہیں۔ قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، پانچ ماہ سے بستر پر ہوں اللہ تعالیٰ جلد صحت عطا فرمائے۔ (بنت عبدالغفار۔ بہاول پور)

ج: اللہ پاک حضرت اشتیاق احمد رحمہ اللہ اور آپ کے پیارے منے کی قبروں پر اپنی رحمت کی بارش برسائے اور آپ کو مکمل صحت عافیت کے ساتھ جلد عطا فرمائے، آمین!

☆ ایک عرصے بعد حاضری دیتے ہوئے ہم آج پھر آمنے سامنے ہو ہی گئے۔ شمارہ ۱۱۰۱ میں 'دستک' پڑھ کر ایک حسین منظر تصور میں گھوم گیا کہ ستاروں کی جھرمٹ میں چاندنی کی تابناکی کا کیا عالم ہوگا۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمیں ان کا امتی بنایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آواز ساتوں آسمانوں کے اس پار سبحان اللہ۔ 'وہ پیار کرتے ہیں' کاوش صاحب جب بھی لکھتے ہیں بہت پیارا لکھتے ہیں۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ارسال ہے۔ 'ان کے کوچے میں' شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی سے عربوں کی محبت مثالی ہے۔ یہ محبت سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کو ہی نصیب ہوئی تھی۔ 'پہلی روٹی' ایک سنجیدہ تحریر تھی۔ آمنے سامنے میں خوب محفل جمی تھی۔ (مستقیم احمد۔ شو مارکیٹ، کراچی)

ج: سوال مگر یہ ہے کہ اتنے عرصے بعد حاضری کیوں؟ مستقیم ہی جب ایسا کرے گا تو پھر منحرف سے کیا شکوہ!

☆ شمارہ ۱۱۰۹ کا سرورق بہت عمدہ لگا۔ 'چاند میاں' کی کہانی ہمیشہ کی طرح لاجواب! 'اعتراف' عمارہ حسین نے کمال کر دیا۔ بہت ہی زبردست کاوش۔ 'ان کے کوچے میں' کتابی صورت میں آنے کا حق دار ہے۔ آمنے سامنے کی تو کیا ہی بات ہے۔ ساری محفلوں میں سب سے بہترین محفل غیبت، چغلی، عیب جوئی سے پاک محفل۔ مخلص لوگوں کی محفل۔ اللہ کرے ہم بھی اس محفل کا حصہ بن جائیں، آمین! (بنت البحر۔ ٹنڈو آدم)

ج: اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی تو کیجیے شکر ادا۔

☆ 'دستک' پڑھی تو ہماری دھڑکن تیز گام ہوگئی کیونکہ آپ کا کارواں بہاول پور کی طرف گامزن ہے۔ اچھا جلدی جلدی قدم رنجہ فرمائیں ہم پلکیں فرشِ راہ کیے آپ کے منتظر ہیں۔ 'مسکراہٹ کے پھول' سے جب ملاقات کی تو وہ بہت شگفتہ نکلے۔ مطالعہ کی خاموش قہقہوں کی آہٹ سے گونج اٹھی۔ طویل انتظار کے بعد بالآخر آپ کا کارواں دکھائی دے رہا ہے، ہمارے ساتھ کھڑے تمام منتظر افراد کے چہرے گلاب کی طرح کھل اٹھے ہیں۔ آپ سرو قد کی وجہ سے تمام شرکائے قافلہ میں سے نمایاں دکھ رہے ہیں۔ 'وقت بتائے گا' محترمہ عائشہ غفنفر اللہ کیا ہی شاندار تحریر کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔ 'پانچ فرق تلاش کریں' ہم ان کے تعاقب میں نکلے اور ان تمام کو گرفتار کرلیا۔ (محمد عربی۔ تھانہ نوشہرہ جدید)

ج: ہمیں آپ کا نام اتنا خوبصورت لگتا ہے کہ بغیر تعریف کے کسی اور بات کا جواب سوجھتا ہی نہیں۔ جیتے رہیں۔

☆ لگتا ہے شمارہ ۱۱۰۰ کا مرکزی خیال ''بھولنا'' ہے۔ 'تعویز محبت' میں حافظ عبدالرزاق بھائی اپنا تعویز بھول گئے۔ یہ شمارے کی بہترین تحریر تھی۔ جاوید بسام کی تحریر 'تنکونے باغیچے کا کیکر' میں دونوں درخت بھول گئے کہ ایک اچھی زندگی کے لیے ایک اچھا انجام بھی ضروری ہے۔ اگلے صفحے پر احمد سدیس ہم سے پوچھتے نظر آئے کہ 'کیا آپ بھول جاتے ہیں' اب ہم انھیں کیا بتائیں کہ ہم تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہم کوئی بات بھول گئے ہیں۔ باقیوں کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر نے بھی ہمیں 'ایک بھولا ہوا سبق' یاد کروانے کی کوشش کی۔ 'کہانی ایک سفر کی' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم بیگ بھی کتاب بھول جانے پر معذرت کرتے نظر آئے۔ ہمیں بھی آپ کا یہ سفرنامہ شاید ۴، ۵ سالوں تک یاد نہ آئے اس لیے پیشگی معذرت۔ (محمد وقاص۔ جھنگ صدر)

ج: یہ بھول آپ کی مگر ہرگز معاف نہ کی جائے گی۔ فوراً پڑھیے کہانی ایک سفر کی! اس سے پہلے کہ 'کہانیاں کئی سفر کی' ہم چھاپ دیں۔

☆☆☆

برائے غزہ

رمضان راشن پیکج

رمضان پیکجز کے لیے
ٹرسٹ کو عطیات دیجئے

ماہ مبارک میں اپنے لیے ثواب اور اپنے پیارے
مرحومین کے لیے ایصال ثواب کا سامان کیجیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

ایک راشن پیکج

35$ یو ایس ڈالر

PAK AID WELFARE TRUST
TOGETHER WE CAN MAKE A DIFFERENCE

پاک ایڈ ویلفیئر ٹرسٹ

A/C Title: Pak Aid Welfare Trust A/C No.: 3048301900220720

Bank: FAYSAL BANK Swift code.: FAYSPKKA IBAN: PK28FAYS3048301900220720

+92300-050 9840 | +92300-050 9833 | www.pakaid.org.pk